جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نظام تعلیم

علامہ موسیٰ جاراللہ کے افکار کا جائزہ

ڈاکٹر محمد ارشد

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

EDUCATIONAL SYSTEM OF JAMIA MILLIA

A STUDY OF MUSA JARULLAH'S VIEWS

Muhammad Arshad, PhD

Associate Professor, Department of Urdu Encyclopedia of Islam,

University of the Punjab, Lahore

Abstract

This paper seeks to study the views of Allama Musa Jarullah, aimed at the reform of educational system (curriculum and teaching methodology) of the Jamia Millia Islamia, Delhi. Musa Jarullah rightly percieved that the traditional educational system had failed to cope with the challenges of the modern age, and its reform is indispensable for the revival of the Muslim Ummah. Musa Jarullah vehemently argued for madrasah-curriculum reform. He also envisaged a scheme for the reform of curriculum for Jamia Millia Islamia (National Islamic University). His proposed scheme for the reform of madrasah / university curriculum is aimed at combining the traditional Islamic learning and modern sciences. This paper argues that Musa Jarullah's proposed scheme for madrasah / university curriculum reform does offer a best blueprint for the reform of the traditional as well as modern institutions of Islamic learning.

Keywords: قرآن پاک، روسی، دہلی، ہندوستان، موسیٰ جاراللہ، مصر، مفتی محمد عبدہ، سنسکرت، بھوپال، ترکی

علامہ موسیٰ جار اللہ

موسیٰ جار اللہ ۶ جنوری ۱۸۷۵ء کو جنوبی روس کے شہر روستوف ڈان میں پیدا ہوئے۔ انھیں ابتدائی دینی تعلیم قازان کے مشہور مدرسہ کول بو یو سے حاصل کی۔ جدید تعلیم کے لیے انہیں روستوف ڈان کے ایک سرکاری مدرسے میں داخل کرایا گیا، جس سے فراغت (۱۸۹۵ء) کے ساتھ ہی انہوں نے دینی علوم کی تحصیل کے لیے بخارا کا رخ کیا اور متوسطات کی تعلیم کے بعد (۱۸۹۸ء-۱۹۰۴ء) عالم اسلام کی علمی سیاحت پر روانہ ہوئے۔ انہوں نے پہلے استانبول اور پھر قاہرہ میں قیام کر دوران میں وہاں کے ممتاز علماء سے استفادہ کیا۔ مصر میں مفتی محمد عبدہ (۱۸۴۹-۱۹۰۵ء) اور شیخ نخیت (م ۱۹۳۵ء) سے اکتساب فیض کیا۔ قازان، بخارا اور مصر و ترکی کے علماء سے استفادہ اور ذاتی محنت و ریاضت سے موسیٰ جار اللہ نے عربی زبان و ادب اور مختلف اسلامی علوم خصوصاً فقہ، فلسفہ اور علم الکلام میں کمال حاصل کر لیا۔ وہ ترکی اور فارسی زبان و ادب میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۸ تا ۱۹۱۰ء کے دوران میں سینٹ پیٹرز برگ کی یونیورسٹی کے کلیۂ قانون سے جدید قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۰ء میں وہ اورنبرگ کے مدرسۂ حسینیہ میں عربی زبان و ادب، تاریخ اسلام، علم الکلام اور تاریخ مذاہب کے استاد مقرر ہوئے۔ لیکن وہاں کے اساتذہ کی طرف سے جدت پسندانہ خیالات و آراء کی مخالفت کے سبب جلد ہی انھیں اورنبرگ چھوڑنا پڑا (۱۹۱۱ء)۔ موسیٰ جار اللہ نے ۱۹۰۵ء میں سینٹ پیٹرز برگ سے معروف روسی مسلم رہنما عبدالرشید ابراہیم کے اشتراک سے ''الفت'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا اور بعد ازاں ایک دوسرا اخبار ''التلمیذ'' کے نام سے جاری کیا۔ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۱۷ء کے دوران میں دینی و فکری موضوعات پر ان کی اٹھارہ کتابیں قازان اور پیٹرز برگ سے شائع ہوئیں۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۷ء کے دوران میں موسیٰ جار اللہ نے روسی مسلمانوں کی سیاسی تحریک میں بھی حصہ لیا۔ روسی علماء و دانش وروں کی تنظیم مسلم کانگرس کے معتمد کے طور پر انھوں نے متعدد کانفرنسیں منعقد کیں۔ جلد ہی انہیں ایک ہر دلعزیز اور روشن خیال تاتاری عالم کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل ہوگئی۔ موسیٰ جار اللہ ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب میں لینن کے شریک کار تھے، تاہم وہ اشتراکی اقتدار کے تحت مسلمانانِ روس کے سیاسی حقوق اور ان کی مذہبی شناخت سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ موسیٰ جار اللہ سیاسی

سرگرمیوں کی پاداش میں اشتراکی انقلابیوں کے ہاتھوں متعدد بار قید و بند سے دو چار ہوئے۔ اسٹالن کے عہدِ اقتدار میں ۱۹۲۸ء سے مسلمانوں کے خلاف طویل اور خونریز مہم کا آغاز ہوا تو مسلمان علماء و دانشور اس کا خصوصی ہدف بنے۔ چنانچہ موسیٰ جار اللہ ۱۹۳۰ء کے اواخر میں ملک سے ہجرت پر مجبور ہوگئے۔ وہ مشرقی چینی ترکستان کے علاقوں (کاشغر وغیرہ) سے ہوتے ہوئے افغانستان کے دار الحکومت کابل پہنچے اور پھر ہندوستان چلے آئے۔ دسمبر ۱۹۳۱ء میں انہوں نے بیت المقدس میں منعقدہ موتمر اسلامی میں روسی مسلمانوں کی نمائندگی کی آئندہ سال (۱۹۳۲ء) انھوں نے برلن میں ایک اسلامی دار الاشاعت قائم کیا۔ ۱۹۳۴ء میں وہ ایران اور عراق کی سیاحت کو نکلے۔ تبریز، تہران، بغداد، موصل، نجف، کرکوک، کربلا اور کوفہ میں انھوں نے شیعی علمی و مذہبی مراکز (مدارس، مزارات و مشاہدات) کی زیارت کی اور شیعی مذہب کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ ۱۹۳۵ء میں مصر واپسی پر انھوں نے شیعہ مذہب پر اپنی محققانہ کتاب ''الوشیعہ فی نقد عقائد الشیعہ'' شائع کی۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۷ء کے دوران میں موسیٰ جار اللہ ہندوستان، ایران، عراق، حجاز اور مصر کی سیاحت میں مشغول رہے۔ حجاز اور قاہرہ میں وہ علوم القرآن پر متعدد کتابوں کی تصنیف و تالیف میں منہمک رہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے وہاں کے کتب خانوں سے ضروری لوازمہ کی فراہمی کے لیے بڑی جانفشانی سے کام لیا۔ ۱۹۳۷ء کے آغاز میں موسیٰ جار اللہ ہند میں وارد ہوئے تو بمبئی سے ہوتے ہوئے بنارس چلے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ جار اللہ کا ہندوستان میں زیادہ تر قیام بنارس اور بھوپال میں رہا۔ بنارس میں قیام کے دوران میں ان کی توجہ تصنیف و تالیف کے علاوہ سنسکرت کی تحصیل اور ہندو فلسفہ و مذہب سے واقفیت بہم پہنچانے پر مرکوز رہی۔ چنانچہ انھوں نے ہندو پنڈتوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے سنسکرت سیکھی، ویدوں اور دیگر ہندو مقدس مذہبی کتب کا درس لیا۔ ۱۹۳۷ء [کے وسط] میں موسیٰ جار اللہ حجاز اور نجد و یمن کی سیاحت کی غرض سے مکہ مکرمہ پہنچے۔ مکہ مکرمہ میں انھوں نے مولانا عبید اللہ سندھی سے بھرپور استفادہ کیا۔ مولانا سندھی سے انھوں نے شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتابیں [الخیر الکثیر، بدور البازغہ، سطعات، الطاف القدس اور تأویل الاحادیث] کے علاوہ شاہ اسماعیل شہید کی ''صعبقات'' پڑھی۔ مزید برآں شاہ ولی اللہ کے فلسفے کے مطابق قرآن کریم کا درس لیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی ''تفسیر الہام الرحمٰن فی تفسیر

القرآن' موسیٰ جار اللہ کو املاء کرائی جسے انھوں نے کامل حزم واحتیاط سے عربی میں قلم بند کیا۔ جب موسیٰ جار اللہ ہندوستان آئے تو اس تفسیر کی بہت سی نقلیں تیار کی گئیں۔ موسیٰ جار اللہ ۱۹۳۸ء میں عبدالرشید ابراہیم کی دعوت پر جاپان چلے گئے۔ ۱۹۳۹ء میں جنگِ عظیم دوم کے آغاز پر وہ ہندوستان میں مستقل قیام کے ارادے سے جاپان سے روانہ ہوئے تاہم پشاور میں برطانوی حکام نے انھیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ ۱۸ ماہ بعد نواب بھوپال حمید اللہ خاں کی مساعی سے ان کو رہائی ملی اور قید کو نظر بندی میں تبدیل کر دیا گیا۔ چنانچہ وہ ۱۹۴۵ء تک شیش محل بھوپال میں سرکاری مہمان کے طور پر (بحالتِ نظر بندی) مقیم رہے۔ نظر بندی کے ایام میں انھوں نے مختلف موضوعات پر عربی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی کی تقریب میں شرکت کی اور اس جامعہ کے نصاب ونظام تعلیم کی اصلاح کی غرض سے تجاویز پیش کیں۔ موسیٰ جار اللہ ہندوستان میں طویل قیام کے بعد ۱۹۴۷ء میں ترکی سے ہوتے ہوئے قاہرہ چلے گئے۔ قاہرہ ہی میں ۲۵/ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ انھیں عفیفہ کے خدیو شاہی قبرستان میں دفن کیا گیا۔(۱)

علامہ موسیٰ جار اللہ بنیادی طور پر ایک عالم اور مصنف تھے۔ انھوں نے ترکی، عربی اور فارسی میں درجنوں کتب یادگار چھوڑی ہیں۔ عربی تصانیف زیادہ تر علوم القرآن، فقہ اور علم الکلام کے موضوعات پر ہیں، جبکہ دوسری تصانیف جو تاتاری زبان (ترکی) میں ہیں مسلمانانِ روس کو درپیش سماجی، سیاسی، اور مذہبی مسائل سے متعلق ہیں۔ موسیٰ جار اللہ تاتاری زبان میں قرآن مجید کے ترجمے کی تحریک کے داعی تھے اور خود اس زبان میں ترجمۂ قرآن کا بیڑا اُٹھایا، جو ترکِ وطن کے بعد ان کے کتب خانہ اور مسودات کے ساتھ دست بُردِ زمانہ کا شکار ہو گیا۔ موسیٰ جار اللہ کی تصانیف میں سے حسب ذیل بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں:

اساس الشرع الاسلامی؛ افادات الکرام فی شرح احادیث بلوغ المرام (عربی، ۱۹۰۸ء)؛ ایام حیاۃ النبی الکریم؛ البنک فی الاسلام؛ تاریخ القراءات وتفسیر الاحرف السبعۃ؛ تاریخ القرآن والمصاحف/کتاب المصاحف الامصار؛ تأمین الحیاۃ والاموال والاملاک (بھوپال، ۱۹۴۴ء)، اس

کتاب کو اردو میں مطیع اللہ افغانی نے منتقل کیا، جو "اسلام اور بیمہ" کے عنوان سے للّٰہی پبلشنگ ہاؤس دہلی کی طرف سے شائع ہوئی (۱۹۴۷ء)؛ ترتیب السور الکریمہ وتناسبھا فی النزول وفی المصاحف (بھوپال: سینٹرل انڈیا پریس، ۱۹۴۴ء)؛ حروف اوائل السور (سنٹرل انڈیا پریس بھوپال، س.ن)؛ ذوالقرنین ویاجوج وماجوج؛ شرح عقیلۃ اتراب القصائد (فن رسم وقراءت پر امام شاطبی کی منظوم کتاب "عقیلہ" کی شرح ہے)؛ صحیفۃ الفرائض (بھوپال، ۱۹۴۴ء): محمد اسلم جیراج پوری (م ۱۹۵۵ء) کے عربی رسالہ "الوراثۃ فی الاسلام" پر تنقید وتبصرہ ہے، جس میں مصنف نے اسلم جیراجپوری صاحب سے اتفاق کرتے ہوئے یتیم پوتے کو وراثت کا حق دار بتایا گیا ہے؛ صرف القرآن الکریم (بھوپال: سینٹرل انڈیا پریس، ۱۹۴۴ء)؛ الصلوٰۃ والصیام فی طول اللیالی والایام؛ فقہ القرآن الکریم (۱۹۱۶ء)؛ القانون المدنی للاسلام؛ القواعد الفقہیہ؛ کتاب الامم الاسلام؛ کتاب الزکوۃ؛ کتاب السنۃ (بھوپال: لیتھو ورکس، ۱۹۴۵ء) (ماڈرن، ص ۲۱۷)؛ حقوق النساء فی الاسلام؛ کفارۃ الافطار؛ لم اعتبر الشرع فی الرؤیۃ الاہلۃ؛ نظام التقویم فی الاسلام؛ نظام الخلافۃ الراشدۃ الاسلامیۃ الیوم؛ نظام النسی عند العرب قبل الاسلام؛ الوشیعۃ فی نقد عقائد الشیعۃ: ابتداءً مکتبہ الخانجی، قاہرہ سے شائع ہوئی تھی۔ سہیل اکیڈمی، لاہور کی طرف سے اوّلین اشاعت کا عکس متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی (م ۱۹۸۲ء) کے قلم اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے (عظمتِ صحابہ اکیڈمی، سہارن پور، س۔ن)؛ شرح کلیات حافظ (فارسی)۔

موسیٰ جاراللہ اہل علم کی نظر میں

موسیٰ جاراللہ کا علمی سرمایہ (ماسوائے شرح کلیات حافظ کے) عربی یا ترکی زبانوں شائع ہوا۔ گو ان کے دو تین رسائل کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا تاہم اردو داں حضرات کی بھاری اکثریت ان کی علمی عظمت سے زیادہ واقف نہیں۔ البتہ مؤقر علمی حلقے ان کے نام اور کام سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ انھوں نے ان کی علمی عظمت کا اعتراف اور مجاہدانہ کردار کی تحسین بھی کی۔ ہندوستان کے متعدد دوسرے ممتاز اہل قلم نے ان کی شخصیت اور علمی فضیلت کے بارے میں بڑے دلآویز انداز میں اپنے

تأثرات وملاحظات کا اظہار کیا ہے، جن میں سے شاہ معین الدین احمد ندوی (۲)، مولانا سعید احمد اکبرآبادی (۳)، ڈاکٹر سید ریاض الحسن (۴)، رئیس احمد جعفری ندوی (۵) اور ڈاکٹر سید عابد حسین (۶) بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ علامہ موسیٰ جاراللہ کے مداحوں اور قدر دانوں میں علامہ سید سلیمان ندوی (۷) اور علامہ ڈاکٹر محمد اقبال بھی شامل تھے۔(۸)

جامعۂ ملیہ اسلامیہ اور علامہ موسیٰ جاراللہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام تحریک ترک موالات وعدم تعاون کے دوران میں عمل میں آیا تھا (۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ/۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء)۔ اس کے قیام کے محرکین میں علی برادران: مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸۔۱۹۳۱ء) وشوکت علی (۱۸۷۳۔۱۹۳۸ء) اور حکیم اجمل خاں (۱۸۶۸۔۱۹۲۷ء) پیش پیش تھے۔ اس جامعۂ ملیہ کو دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مولانا محمود حسن (۱۸۵۱۔۱۹۲۰ء) کی سرپرستی حاصل تھی، اور اس کا افتتاح بھی انھی کے ہاتھوں ہوا۔(۹) اس جامعہ کے قیام کا مقصدِ اساسی یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم کا ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جو سرکاری اثر ورسوخ سے آزاد ہو، اور مسلمانوں کی دینی وملی آدرشوں کا آئینہ دار ہو۔(۱۰) مزید برآں اس کی علمی فضا علی گڑھ یونیورسٹی کے ماحول، جو مسلمانوں کی نئی نسل کے ذہنوں میں انگریزی تہذیب وتمدن سے مرعوبیت، نیز حکومت سے وفادارانہ و خیر خواہانہ جذبات کو پروان چڑھانے کا موجب تھا، سے مختلف ہو۔ اس جامعہ کی شناخت کے تین بنیادی ستون: جدید تعلیم، اسلام، اور قومیت ووطنیت قرار پائے۔ جامعۂ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں نے قدیم وجدید (روایتی اسلامی وعربی اور جدید مغربی) کے امتزاج کے متعلق بڑے بلند عزائم کا اظہار کیا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر نے، جو اس کے شیخ الجامعہ تھے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے جو تعلیمی اسکیم تیار کی تھی اس کے مطابق ''جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اس سے وابستہ تعلیمی اداروں سے ہمیں نہ صرف موجودہ معیار کے مطابق مہذب نوجوان تیار کرنا، بلکہ ایسے سچے اور پکے مسلمان پیدا کرنا ہیں جو اسلامی جذبہ سے سرشار ہوں اور جنھیں اپنے مذہب سے کافی واقفیت ہو، تاکہ وہ اسلامی اداروں کے اندر رہ کر پوری آزادی سے کام پیدا کرسکیں''۔(۱۱) چنانچہ آغاز ہی سے جامعہ میں تفسیر قرآن، عربی زبان وادب اور

اسلامی تاریخ کی تدریس کا بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔(۱۲) مولانا محمد اسلم جیراج پوری اور مولانا عبید اللہ سندھی کے شاگرد اور ان کے طرزِ تفسیر کے ممتاز عالم خواجہ عبدالحی فاروقی اس جامعہ میں درس دیتے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بعض پہلوؤں سے علی گڑھ کے ردِعمل کا نتیجہ تھی، اور اسے علماء کی سرپرستی بھی حاصل تھی تاہم قدیم و جدید کے امتزاج سے متعلق اس کے بانیوں کے خواب کو تعبیر نہ مل سکی۔(۱۳) زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کے نصاب میں جدید علوم وفنون کی تعلیم و تدریس کو غلبہ حاصل ہوگیا، حتیٰ کہ نظامِ تعلیم کے اعتبار سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اس جامعہ کے مابین کوئی جوہری فرق باقی نہ رہا۔

جامعۂ ملیہ اسلامیہ شروع دن ہی سے آزادی وحریت کے متوالوں کا مرکز رہی۔ اس کے بانی جدوجہد آزادی میں پیش پیش رہے۔ مولانا محمود حسن کے تلمیذ خاص مولانا عبید اللہ سندھی طویل عرصہ جلا وطنی کے بعد وطن لوٹے تو اس جامعہ میں ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ علامہ موسیٰ جاراللہ کو اپنے استاذ مکرم مولانا عبید اللہ سندھی کی طرح جامعۂ ملیہ سے خصوصی قلبی تعلق تھا۔ علامہ موصوف ہفتوں وہاں قیام کرتے، جہاں اساتذہ وطلبہ ان سے مستفید ہوتے۔ علامہ موصوف کو ان کے علم وفضل اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان کی دردمندی اور روسی مسلمانوں کی حریت وآزادی کے لیے عملی جدوجہد کی بنا پر بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔(۱۴)

موسیٰ جاراللہ جب تک ہندوستان میں مقیم رہے جامعۂ ملیہ سے ان کا علمی تعلق بدستور قائم رہا۔ ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی کی تقریبات میں شریک ہوئے۔ اس موقعے پر جامعۂ ملیہ اسلامیہ کے نظامِ تعلیم (نصاب وطریق تعلیم) کی اصلاح کی ایک اسکیم، عربی زبان میں ایک رسالہ کی صورت میں مرتب وطبع کر کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو پیش کی۔ نظامِ تعلیم کی اصلاح سے متعلق ان کی تجاویز پر مشتمل اس رسالے کا اردو ترجمہ جامعہ کے ماہنامے جامعہ کے شمارہ بابت مئی ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ موسیٰ جاراللہ نے اس رسالے میں اولاً قدیم نظامِ تعلیم کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور ثانیاً اصلاح احوال کے لیے تجاویز پیش کی ہیں۔ علامہ موسیٰ جاراللہ کی یہ تعلیمی اسکیم صرف جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے ہی خاص نہ تھی، بلکہ وہ اس کو عالم اسلام کی دینی درس گاہوں میں روبہ عمل دیکھنا چاہتے تھے۔

روایتی دینی درس گاہوں کا نظام تعلیم: ناقدانہ جائزہ

جامعۂ ملیہ اسلامیہ کے نظام تعلیم سے متعلق زیر بحث رسالے کے مندرجات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ موسیٰ جاراللہ روس اور وسطی ایشیا کی مسلم جمہوریاؤں کی روایتی اسلامی درس گاہوں کے نظام تعلیم سے شدید طور سے غیر مطمئن تھے اور اس کی اصلاح کے آرزومند تھے۔ انھیں پہلی بار عالم اسلام کی طویل سیاحت (۱۸۹۸-۱۹۰۴ء) کا موقعہ میسر آیا تو انھوں نے افغانستان، ہندوستان، ایران وترکی اور عرب ممالک کی درس گاہوں اور ان کے نصاب وطریق تعلیم سے راست طور پر واقفیت بہم پہنچائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں ندوۃ العلماء کی تحریک اصلاح تعلیم کے نتیجے میں لکھنؤ میں ایک دارالعلوم قائم ہو چکا تھا اور اس کے نصاب میں انگریزی اور تاریخ وجغرافیہ جیسے جدید علوم متعارف کرائے جا چکے تھے؛ جبکہ مصر میں جامعۂ ازہر کے نظام تعلیم میں اصلاحات کے سلسلے میں مفتی محمد عبدہ کی مساعی قدامت پسند علماء کی طرف سے شدید مخالفت کے سبب سے ناکامی سے دوچار ہو چکی تھیں۔(۱۵) سلطنت عثمانیہ میں تنظیمات کے نام سے جو ہمہ گیر اصلاحات ہوئیں (۱۸۳۹-۱۹۰۸ء) انھوں نے نظام تعلیم کا رخ مغربیت کی طرف موڑ دیا تھا۔(۱۶) چنانچہ اس وقت عالم اسلام میں نظام تعلیم دو متوازی دھاروں (قدیم اور جدید) میں بہہ رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ موصوف ندوۃ العلماء اور جامعۂ ازہر کے اصلاحی تجربات اور ان کے نتائج وثمرات سے مطمئن نہ تھے۔

موسیٰ جاراللہ مسلم ممالک کی قدیم اسلامی درس گاہوں میں رائج نظام تعلیم کو ملت کے دینی و دنیوی مصالح کی تکمیل کے لیے غیر موزوں خیال کرتے تھے۔ ان کی نظر میں بلادِ اسلامیہ میں صدیوں سے رائج ناقص نظام تعلیم مسلمانوں کی معاشرتی ابتری اور اقتصادی پس ماندگی کا باعث تھا۔ قدیم روایتی نظام تعلیم ملتِ اسلامیہ کے دینی ودنیوی مصالح اور حاجات کی تکمیل میں ناکام ہو چکا تھا اور نظام تعلیم انقلابی نوعیت کی اصلاحات کا طالب تھا۔ موسیٰ جاراللہ کی رائے میں ترکستان، ترکی اور روس میں جو انقلاب آیا، جس میں نہ شرعی عدالتیں بچیں اور نہ مکاتب اور دینی مدرسے، وہ سب کا سب نظام تعلیم کے باب میں ملت اسلامیہ کے اجتماعی اور سیاسی گناہوں اور کوتاہیوں کے سبب سے ہوا۔ کیونکہ شرعی عدالتیں

اور دینی مدرسے صدیوں سے زوال وانحطاط کی حالت میں تھے، چنانچہ وہ جدید متمدن دنیا کی طرف سے آنے والی انقلابی لہروں کا مقابلہ نہ کر سکے اور زمین بوس ہو گئے۔(۱۷)

موسیٰ جار اللہ طویل غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ''ممالک اسلامیہ میں جو دینی مدارس ہیں، ان کا نظام اور نصاب تعلیم مسلمانوں کی ضرورتوں کے مطابق نہیں ہے اور اس سے نہ تو ان کی دینی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور نہ دنیوی''۔ علامہ کا یہ خیال یہ تھا کہ اسلامی ممالک کے دینی مدارس کا ناقص نظام تعلیم ایک بڑا سبب اور ذریعہ ہے مسلمان ممالک میں جدید سیکولر نظام تعلیم وقانون کی ترویج کا۔ اسی کے سبب ممالک اسلامیہ کے اندرونی معاملات میں غیر ملکی اجنبی سیاست کو مداخلت کے مواقع مل رہے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر مصر میں شرعی عدالتوں کی بجائے مخلوط عدالتیں قائم کی گئیں اور خلافت عثمانیہ کے اسلامی نظام عدالت پر تنظیمات خیریہ کے نام سے بندشیں عائد ہوئیں۔ اس معاملے میں جو حشر خلافت عثمانیہ اور مصر کا ہوا چار و نا چار ایران اور افغانستان کی سلطنتیں بھی انھی کی راہ پر چلنے لگیں۔ علامہ موسیٰ جار اللہ کی رائے میں عدالتی اور قانونی نظام میں اس تباعی کا سب سے بڑا سبب شرعی عدالتوں اور دینی مدرسوں کی زبوں حالی تھی۔(۱۸)

علامہ موسیٰ جار اللہ نے ایران، ترکی اور روس کے ماتحت مسلم ریاستوں میں دینی مدارس کی زبوں حالی اور ان کے انجام کا جائزہ پیش کرنے کے بعد بڑی دردمندی سے اہل ہندوستان کو دینی مدارس کے نظام تعلیم کی اصلاح کی دعوت دی، انھیں مدارس کی خستہ حالی سے اور جدید تقاضوں سے ان کے اغماض کے برے نتائج سے آگاہ کیا۔ علامہ موصوف رقم طراز ہیں:

''غرضیکہ ان دنوں دینی مدارس کے مہتمموں اور ان کے اساتذہ کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ مدارس دینیہ کے نظام تعلیم کی اصلاح کریں اور وہاں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں ان کی تکمیل کے ذرائع بہم پہنچائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اور سب مسلمان قوموں کے مقابلے میں اس امر کی زیادہ استطاعت رکھتے ہیں کہ جامعہ اسلامیہ علمیہ قائم کریں''۔(۱۹)

علامہ موسیٰ جار اللہ اسلامی درس گاہوں کے نظام تعلیم میں دورس اصلاح وتبدیلی کے شدید آرزو مند تھے۔ اس باب میں وہ قدیم وجدید کے امتزاج بالفاظ دیگر وحدت نظام تعلیم کے اصول کے داعی

تھے۔موسیٰ جاراللہ کے مذکورہ رسالے کے مندرجات کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ طالب علمی (جس کا سلسلہ، جامعہ ازہر تک پھیلا ہوا ہے) سے ہی ان کے دل میں یہ آرزو سمائی ہوئی تھی کہ ایک ایسا اسلامی دارالعلوم قائم کیا جائے، جس میں ایک طرف اسلامی علوم کی درجۂ کمال تک تعلیم ہو اور دوسری طرف دور جدید کی متمدن دنیا کی درس گاہوں کی اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں جو علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں، ان کی بھی اس میں تعلیم کا انتظام ہو۔انھوں نے دنیائے اسلام (اپنے قدیم وطن وسطی ایشیا، ہندوستان، مصر وشام اور ترکی) کی طویل سیاحت سے پیٹرزبرگ واپسی پر دینی مدارس کے نظام تعلیم کی اصلاح کے لیے تحریک کا آغاز کیا۔انھوں نے ۱۹۰۵ء میں نظام تعلیم کے موضوع پر ایک کتاب شائع کی جس میں اسلامی مدارس کے نصاب اور طریق تعلیم کی اصلاح سے متعلق اپنے خیالات وآراء کا اظہار کیا۔انھوں نے اپنی اس تالیف میں اسلامی ممالک کے مدارس میں رائج نظام تعلیم کا تنقیدی جائزہ پیش کیا، ساتھ ہی اصلاح کی تدابیر بھی بیان کردیں۔انھوں نے اس میں قوت واستدلال سے اس تصور کو پیش کیا کہ دینی مدارس کے نظام تعلیم کی اصلاح کے بغیر دین حق کا اظہار اور متمدن دنیا میں ہدایت اسلام کا فروغ ممکن نہیں۔(۲۰)

موسیٰ جاراللہ نے نصاب تعلیم اور طریقِ تدریس کے متعلق کچھ اصول بھی مرتب کیے۔روسی ترکستان کے علماء اور مدارس کے کارپردازوں کے سامنے اپنی تجاویز اور علوم دینیہ کی تدریس کا پروگرام پیش کیا۔انھوں نے اپنے تجویز کردہ طریق تعلیم کے عملی اطلاق کی غرض سے درس وتدریس کا آغاز کیا۔(۲۱) لیکن ملک کی مخدوش صورت حال نیز ملی وسیاسی سرگرمیوں میں مشغولیت کے سبب ان کا تجویز کردہ اصلاحی نظام جڑ نہ پکڑ سکا۔موسیٰ جاراللہ اپنے تجویز کردہ نصاب وطریق تعلیم کو عملی طور پر بروئے کار لانے کے لیے جامعۂ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کو زیادہ موزوں خیال کرتے تھے۔ان کے خیال میں ہندوستان میں جو درس گاہ اصلاح کے لیے قریب ترین تھی، اور اس کی صلاحیت بھی رکھتی تھی کہ اسے ایک مثالی ومعیاری جامعہ علمیہ بنادیا جائے، وہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ تھی۔(۲۲)

جامعۂ ملیہ اسلامیہ کا نظام تعلیم: اصلاحی تجاویز

جامعۂ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی کے موقع پر شائع کردہ اپنے رسالے میں موسیٰ جاراللہ نے

دراصل دورِ جدید کی جامعۂ اسلامیہ (اسلامی یونیورسٹی) کا جو نصاب وطریق تعلیم ہونا چاہیے، اس کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں عصر حاضر میں اسلامی جامعات میں کون سے مضامین پڑھائے جائیں ان کا بیان کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ آج کل کی متمدن دنیا کے مدارس میں اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ نصاب میں داخل ہونے چاہئیں (۲۳)۔ انھوں نے روایتی اسلامی علوم کی تدریس میں نظم وترتیب کی وضاحت کے ساتھ ساتھ منہجِ تدریس بھی تجویز کیا ہے۔ موسیٰ جاراللہ کے تجویز کردہ نصاب تعلیم نیز منہجِ تدریس کے خدوخال حسب ذیل ہیں:

ا: علامہ موسیٰ جاراللہ کی رائے میں تدریس کا پہلا اور سب سے اہم اصول یہ ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم میں ضروری ترتیب کا خیال رکھا جائے۔؛ مثلاً دینی علوم کی تعلیم سے پہلے ادبی علوم کی تعلیم ہونی چاہیے۔ لغت، صرف ونحو اور بلاغت کی تعلیم کو قرآن حکیم کے مطالب اور حدیث نبوی کے مجموعوں کی تعلیم پر مقدم رکھا جائے؛ اور علوم فقہ اور علوم کلام وفلسفہ پر قرآن کریم اور سنت نبوی کی تعلیم کو۔ علامہ نے اپنی توجیہ بایں الفاظ بیان کی ہے:

> ''بات یہ ہے کہ فقہ اسلامی اور شریعت اسلامی کے یہ جو سارے علوم ہیں ان کا اصل سرچشمہ تو کتاب وسنت ہی ہے۔ اب اگر ایک شخص فقہ وعقائد کی تعلیم تو حاصل کرتا ہے لیکن قرآن وسنت سے بے بہرہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی یہ ساری محنت اکارت جائے گی، اور ایسی حالت میں وہ کتب فقہ سے فراغت حاصل کر لے گا، لیکن نہ اس کے دل میں اور نہ اس کے دماغ ہی میں اسلام کی روح اور اس کی سمجھ پیدا ہوگی''۔ (۲۴)

علامہ موصوف کے نزدیک علوم اسلامیہ کی تعلیم میں ضروری ترتیب کو ملحوظ نہ رکھنے کا ایک اور نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے طالب علم کوئی کتاب شرح اور حواشی کی مدد کے بغیر سمجھ نہیں پاتا۔ ان کے خیال میں طالب علم کا اپنے سبق کو سمجھنے کے لیے شرح وحاشیے کا محتاج ہونا اور متن کتاب کے بجائے اس کی طویل شرحوں اور حاشیہ در حاشیہ کے مطالعے میں لگے رہنا موجودہ دینی نظام تعلیم کی خرابی کا بہت بڑا سبب ہے۔ چنانچہ ان کی رائے میں پہلے عربی زبان کی تحصیل ضروری قرار دی جائے اور اس کے بعد قرآن وسنت کی تعلیم ہو اور پھر فقہ وکلام کی باری آئے۔ (۲۵)

۲: اس ضمن میں علامہ موسیٰ جاراللہ کا تجویز کردہ دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر فن اور ہر علم کو مع اس کے تمام مسائل کے اپنی اپنی باری سے پڑھایا جائے یعنی یہ نہ ہونا چاہیے کہ ایک وقت میں ایک فن کے بعض مسائل پر اکتفا کر لیا جائے یا ایک فن کی کسی کتاب کی بعض فصلوں کا پڑھ لینا کافی سمجھ لیا جائے۔ علامہ کی رائے میں اگر تعلیم میں اس پہلے اور دوسرے اصول کا لحاظ رکھا جائے گا تو طالب علم شرحوں اور حواشی سے بالکل مستغنی ہو جائے گا اور وہ اپنے اسباق کو اچھی طرح سمجھ بھی سکے گا اور انھیں یاد بھی کر لے گا(۲۶)۔

۳: علامہ موسیٰ جاراللہ نے عربی ادب کی تدریس کا طریق بھی بیان کیا ہے۔ ان کی رائے میں عربی ادب کی تدریس کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ طالب علم قرآن کریم اور سنت نبوی کے مطالب و معانی کو سمجھ سکے۔ چنانچہ ان کے خیال میں اس ضمن میں مناسب اور مفید یہ ہے کہ پڑھانے کے لیے ادب میں سلفِ قدیم کی کتابوں کا انتخاب کیا جائے یا ادب کی ایسی کتابیں چنی جائیں جو سلف قدیم کے اصولوں پر مدون کی گئی ہوں۔ نیز معلم کو چاہیے وہ عربی ادب کی تعلیم کے ضمن میں نحو و صرف کے مسائل کو اجمالی طور پر طالب علم کے سامنے زبانی بیان کرے۔ اس سلسلے میں انھوں نے صرف و نحو میں چند کتب بھی تجویز کی ہیں۔ مثلاً نحو میں وہ ''الدروس النحویۃ'' تجویز کرتے ہیں۔ جہاں تک علم صرف کا تعلق ہے ان کی رائے میں معلم ''شافیہ'' اور ''المزہر'' کے مسائل شاگردوں کو زبانی پڑھا سکتا ہے، کیونکہ اصل مقصود ''شافیہ'' اور ''المزہر'' کے مسائلِ صرف کو ذہن نشین کرنا ہے نہ کہ ان کتابوں کی عبارتوں کو حل کرنا۔ چنانچہ علم نحو میں ''کافیہ'' اور اس پر رضی کی شرح اور اسی طرح ''الفیہ'' اور اس کی شرح جورشمونی نے لکھی ہے، یہ دونوں کتابیں اور ان کی یہ شرحیں کافی ہیں۔ ان کے خیال میں جو طالب علم ان مسائل کو سمجھ لے اور ان کو ضبط کر لے وہ صحیح معنوں میں نحوی ہے اور وہ اس قابل ہے کہ قرآن کریم کے معانی اور سنت نبوی کے مطالب کو بڑی آسانی سے بہت اچھی طرح سمجھ سکے۔(۲۷) موسیٰ جاراللہ کے خیال میں عربی ادب اور صرف و نحو پر اس طرح دسترس حاصل کرنے کے بعد طالب علم کے لیے عروض اور قوافی کا علم حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں رہے گا۔ اس غرض سے ''متن الکافی''، ''منظومۃ الصبیان'' اور ''الخزرجیہ'' وغیرہ کتابیں ٹھیک رہیں گی۔ علامہ تجویز کرتے ہیں کہ اس کے بعد طالب علم ایک قدم اور آگے بڑھائے اور وہ عربی اشعار کے دیوان اور عہد جاہلیت کے تاریخی واقعات کا مطالعہ کرے۔ اس سلسلے

میں وہ جاہلی ادب کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ان کے الفاظ میں: ''شعرائے ادب کے یہ جو دیوان ہیں اور عہد جاہلیت کے متعلق ائمہ ادب نے اپنی کتابوں میں جو معلومات جمع کی ہیں، اسی میں دراصل سرچشمہ ہے قرآن کریم اور سنت نبوی کی زبان کا اور انھی میں قرآن کریم اور سنت نبوی میں مستعمل شدہ الفاظ وکلمات کے شواہد مل سکتے ہیں اور نیز ادبی کتابوں سے عربوں کی تاریخ، ان کی زندگی کے نظام، ان کی معاشرت کے آداب، ان کے اخلاق اور ان کے علوم وتخیلات کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلے میں کتاب الاغانی خاص طور پر مفید ہے''۔(۲۸)

۴: موسیٰ جار اللہ کی رائے میں جب طالب علم اوپر کی سب منزلوں سے گذر چکے تو پھر اسے سنن و احادیث کی کتابیں شروع کرنی چاہئیں۔معلم کو چاہیے کہ وہ سنت اور حدیث میں موطا امام مالک، اور تجرید بخاری سے ابتدا کرے اور چند مہینوں کے اسباق انہیں ختم کرا دے۔موطا اور تجرید بخاری کے پڑھانے کے دوران میں اصولِ حدیث کے سلسلے میں معلم محدثین کی اصطلاحیں ابن حجر العسقلانی کی کتاب ''النخبۃ الفکر'' اور اس کی شرح '' النزہۃ النظر'' کی مدد سے شاگردوں کو ذہن نشین کرا سکتا ہے۔ اصولِ حدیث کے موضوع پر کتاب ''النخبۃ الفکر'' کو وہ بڑا مفید گردانتے ہیں۔علامہ موسیٰ کی رائے میں موطا اور تجرید پڑھانے کے بعد صحیح احادیث کی جو چھ کتابیں ہیں ان کو پڑھایا جائے۔اس کے بعد امام طحاوی کی کتاب ''معانی الآثار'' کو استاد شاگردوں کے سامنے خود پڑھتا چلا جائے اور اس میں نہ کسی تشریح کی ضرورت ہے اور نہ کسی حاشیے سے مدد لینے کی، کیونکہ طلبہ میں تو اسے سمجھنے کی پہلے ہی سے استعداد پیدا ہو چکی ہوگی۔ہاں اس ضمن میں استاد کی کوئی اپنی تحقیقات ہوں تو وہ ''معانی الآثار'' پڑھتے وقت طلبہ کے گوش گذار کر سکتا ہے۔(۲۹)

۵: موسیٰ جار اللہ کی مجوزہ اسکیم کے مطابق علم حدیث کے بعد قرآن کریم کے مطالب ومعانی کی تعلیم ہونی چاہیے۔اس میں پہلے علوم قرآن کے متعلق جو مختصر کتابیں ہیں وہ پڑھائی جائیں، مثلاً امام شاطبی کی '' الشاطبیہ والعقیلہ'' اور امام الجزری کی '' الفیۃ الطیبۃ''۔اس کے بعد استاد قرآن کریم کے مطالب ومعانی کی شروع سے لے کر آخر تک شاگردوں کے سامنے تشریح کرتا چلا جائے، اور اس میں وہ ''جلالین'' اور ''بیضاوی'' سے مدد لے سکتا ہے۔موسیٰ جار اللہ قرآن کریم کے مطالب ومعانی کی تفہیم کے مقصد سے قرآن کریم کی آیات کے نظم وترتیب کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں۔نظم وترتیب کے معاملے

میں ان کے نزدیک نہ تو کسی شخص کی رائے کافی ہے، اور نہ کتب علوم القرآن میں اس ضمن میں جو کچھ مذکور ہے وہ پوری رہنمائی کرسکتا ہے۔ ان کے خیال میں جہاں تک کہ آیات کے اسباب نزول کا تعلق ہے وہ تمام کا تمام ثابت نہیں اور جو ثابت بھی ہے وہ نظم آیات میں پوری طرح مدد نہیں دے دیتا۔ بایں ہمہ وہ فہم قرآن میں اسباب نزول کو مفید خیال کرتے ہیں۔(۳۰)

۶: موسیٰ جارالله کے تجویز کردہ منہاج میں حدیث اور قرآن کریم کی تعلیم وتدریس کے بعد علم عقیدہ (علم کلام) کی باری آتی ہے۔ اس ضمن میں وہ امام طحاوی کی کتاب بیان السنۃ یا شیخ محمد عبدہ کے رسالہ التوحید کو مناسب قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک علم الکلام میں کتاب ''الموافق'' سب سے بہتر ہے، اور کتاب ''مدارج السالکین'' میں اصول کلام اور اصول تصوف کو بہت اچھے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ قدیم فلسفہ الٰہی کے لیے ''حکمۃ العین'' جبکہ منطق میں ''مختصر'' اور ''التہذیب'' کو پڑھنا چاہیے۔ ان کتابوں کو دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ دو سال کی مدت میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ ان کی رائے میں فقہ کے لیے ''تنویر الابصار'' ایسی مختصر کتاب ٹھیک ہے اور اصول فقہ میں ''التوضیح'' اور ''المستصفی'' پڑھنی چاہیے۔ اس کے بعد ''الہدایۃ'' اور ''مجلۃ الاحکام العدلیہ'' کو پڑھا جائے۔(۳۱)

۸: موسیٰ جارالله کے مجوزہ تعلیمی اسکیم کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ حدیث کے ساتھ ساتھ سیرت نبوی کے درس ومطالعہ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس باب میں وہ کمزور اور ضعیف احادیث و روایات پر مبنی کتب مغازی وسیرت کے بجائے مستند وصحیح روایات پر مبنی کتب تجویز کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی رائے میں سیرت نبوی کے موضوع پر سب سے بہتر کتاب امام ابن القیم الجوزیہ کی ''زاد المعاد'' ہے۔ ان کی رائے میں اس کتاب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بیان کے علاوہ آپ کی احادیث اور سیرت سے سیاسی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں فقہی احکام بھی مستنبط کیے گئے ہیں۔ اگر طالب علم اس کتاب کو پڑھ لیں تو ان کے اندر اجتہاد اور مسائل کو استنباط کرنے کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔(۳۲)

۷: موسیٰ جارالله حکمت دین یعنی اسلامی احکام کے اسرار وحکم کی معرفت کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے استاذ مولانا عبید اللہ سندھی کی طرح شاہ ولی اللہ کی تصانیف، خصوصاً ''حجۃ اللہ البالغہ'' سے بڑے متاثر نظر آتے ہیں۔ موسیٰ جارالله کے نزدیک ''حجۃ اللہ البالغہ''

شریعت کے اصول اور ان کی حکمت کے موضوع پر سب سے اچھی کتاب ہے، جس کے درس ومطالعہ سے آج کے مدنی اور اقتصادی قوانین پر شرع اسلامی کو جو فضیلت حاصل ہے، اس کا صحیح اندازہ ہوجاتا ہے۔(۳۳)

۸: موسیٰ جار اللہ جامعہ اسلامیہ کے نصاب میں جغرافیہ اور قدیم علم الہیئت کی تدریس وتعلیم کو بھی بڑا اہم خیال کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں قرآن کریم میں فرائض دین اور احکام الٰہی سے کہیں زیادہ کائنات، آسمانوں، ستاروں، اور افلاک کا ذکر آتا ہے، لیکن ان کی تشریح میں تفسیروں میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل ناکافی ہے۔ لہٰذا جامعہ اسلامیہ کا فرض ہے کہ وہ تخلیق سماوی کے ان عجائبات کو طلبہ کے ذہن نشین کرنے کے لیے قدیم اور جدید ہیئت کو نصاب میں داخل کرے اور آج کل متمدن ملکوں میں نظام شمسی اور ستاروں کے جو اطلس چھپ چکے ہیں، علم الافلاک کو پڑھانے میں ان سے کام لے۔ ان کی رائے میں آسمانوں اور کواکب کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں آیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ہر مسلمان عالم دین کو چاہیے کہ آج کل متمدن دنیا میں جو اطلس فلکی رائج ہیں وہ ان سے ضرور استفادہ کرے۔ موسیٰ جار اللہ قدیم علم ہیئت کے درس ومطالعہ کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں "پچھلے زمانے میں مسلمانوں کے ہاں قدیم ہیئت کا رواج رہا ہے۔ افلاک وکواکب کی نقل وحرکت کا اس ہیئت کے ذریعے بہت ہی اچھا اور مکمل نظام سوچا گیا تھا اور یہ نتیجہ تھا دنیا کے بڑے بڑے فلسفی دماغوں (فارابی، ابن سینا اور نصیر الدین طوسی) کی محنت کا۔ چنانچہ مفسرین نے اسی ہیئت کو درست سمجھ کر قرآن کریم کی تفسیریں بھی لکھیں۔ قدیم ہیئت کی اس تاریخی اہمیت کے خیال سے جامعہ اسلامیہ کے نصاب میں اس کو ضرور شامل کرنا چاہیے۔(۳۴)

۹: موسیٰ جار اللہ فارسی زبان وادب کی تعلیم وتدریس کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں فارسی زبان وادب میں مہارت اس زبان میں موجود نہایت وقیع علمی وادبی ثروت سے استفادے کی کنجی ہے، جبکہ اس سے صرف نظر محرومی وخسران کا موجب ہے۔ نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ تاریخ انسانی میں جو بھی بڑے بڑے شعراء گزرے ہیں، اور انھوں نے جو منظومات چھوڑے ہیں ان کا اہم ترین حصہ فارسی زبان میں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جامعہ اسلامیہ میں فارسی زبان یعنی

سعدی اور جامی کی زبان بھی پڑھی جائے تا کہ طلبہ ان حکماء اور شعراء کے آثار اور ان کے دواوین کا مطالعہ کرسکیں۔اس ضمن میں مولانا رومی کی مثنوی اور خاقانی، نظامی اور جامی کی کلیات اور اسی قبیل کے دوسرے شعراء کا کلام ضرور پڑھنا چاہیے۔(۳۵)

۱۰: موسیٰ جاراللہ یونانی ادب کے بعض شہ پاروں (ترجمہ شدہ درزبانِ عربی) کے مطالعہ کو بھی مفید خیال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ یونانی شاعر ہومر کے ادبی شہ پارے Iliad کے عربی ترجمے ''الیادہ'' [فارسی: ایلیاد] کو ضرور داخلِ نصاب کرنا چاہتے ہیں۔ان کے خیال میں عربی میں یہ مفیدترین کتاب ہے چنانچہ عربی شعراء کے دواوین اور عرب ادباء کی کتابوں کو پڑھنے کے بعد ''الیادہ'' کے عربی ترجمے کا مطالعہ ادبی وعلمی لحاظ سے بہت ضروری ہے۔(۳۶)

۱۱: موسیٰ جاراللہ ادیان ومذاہب عالم کو بھی جامعہ اسلامیہ کے نصاب کا لازمی جز وچاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ''علمائے اسلام کے لیے انجیل وتورات کا جاننا بے حد ضروری ہے۔اس لیے جامعہ اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں ان کا نہ ہونا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں اور نہ طلبہ کا ان کی تعلیم سے محروم رہنا مناسب ہے۔چونکہ قرآن کریم میں بڑی کافی تعداد میں انجیل وتورات کے قصوں کا ذکر آیا ہے اور اکثر آیات میں ان کے احکام وقوانین کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے، اور بہت سی جگہوں میں انجیل وتورات کے مذکورہ شدہ حالات وواقعات کی تصحیح فرمائی گئی ہے، اس لیے قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے ان دونوں صحیفوں کا مطالعہ ضروری ہے۔موسیٰ جاراللہ تورات وانجیل کو ان کی قدیم الاصل زبانوں میں پڑھنے کے بجائے ان کے تراجم کو کافی خیال کرتے ہیں۔وہ ان کتابوں میں تحریف ونسخ کی بحثوں میں پڑنے کے بجائے انھی کو حجت مان لینا ضروری خیال کرتے ہیں۔'' بے شک علمائے اسلام کی بہت بڑی تعداد انجیل وتورات کی تحریف اور نسخ کی قائل ہے، لیکن ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان دو صحیفوں کے جو بھی ترجمے اس وقت ہمارے سامنے ہیں ہمیں انھیں کو بطور حجت کے مان لیں تو اس سے بھی قرآن کریم کی عظمت کے بہت سے شواہد ہمیں مل جائیں گے''(۳۷)۔

موسیٰ جاراللہ نے علمائے اسلاف کے مطالعات تورات وانجیل میں موجود بعض علمی فروگذاشتوں اور کمزوریوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ان کے خیال میں امام رازی نے ''تفسیر کبیر'' میں تورات وانجیل

پر جو بڑی بڑی بحثیں کی ہیں، ان کا ایک حصہ تو واقعی قابلِ قبول ہے لیکن ایک حصہ رد کیے جانے کے قابل۔ البتہ ان کی رائے میں امام قرافی نے اپنی کتاب ''الاجوبۃ الفاخرۃ'' میں تورات وانجیل کے جو اقتباسات دیے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں۔ امام صاحب ان سب علمائے اسلام میں جنھوں نے کہ ان دونوں صحیفوں کو پڑھا، پرکھا اوران کی جانچ پڑتال کی، علمی اعتبار سے سب سے زیادہ اونچے درجے پر ہیں۔ امام آلوسی نے بھی اس ضمن میں اپنی کتاب ''القول الفصیح فی ما۔۔۔عبدالمسیح ''میں جو کچھ لکھا ہے بہت اچھا اور بلند پایے کا ہے۔ اورمولانا رحمت اللہ ہندی[کیرانوی] کی کتاب ''اظہارالحق'' کی تو تعریف نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر گویا عیسائی مشنریوں کی زبانیں ہمیشہ کے لیے بند کردیں۔(۳۸)

علامہ موسیٰ جاراللہ کے افکار وخیالات سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے ایک ایسے نظام تعلیم کی تشکیل کے داعی وعلمبردار ہیں، جس کا نصاب روایتی اسلامی اورجدید مغربی علوم وفنون کا جامع ہو، جس میں اسلامی اورعصری دونوں علوم پڑھائے جائیں۔ وحدت نظام تعلیم کے سلسلے میں ان کی یہ دعوت صرف جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارپردازوں کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ تمام عالم اسلامی کے لیے ہے۔ ان کی پختہ رائے یہ ہے کہ دنیائے اسلام کی اسلامی جامعات کا نظام تعلیم امت کے مصالح سے میل نہیں کھاتا، جبکہ دوسری طرف جدید متمدن (مغربی) کی طرز پر جو بھی یونیورسٹیاں اور کالج ہیں ان میں سے کسی میں بھی علوم اسلامی کی تعلیم کا پورا انتظام نہیں ہے۔ ان جدید درس گاہوں میں طلبہ کو ان علوم کی تکمیل کرنے کا کہیں موقع نہیں ملتا۔(۳۹) اسلامی علوم میں اعلیٰ مہارت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ وہ مسلمان طلبہ (نوجوان لڑکوں اورلڑکیوں) کوتحریک دیتے ہیں کہ وہ متمدن ملکوں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ان علوم وفنون کو حاصل کریں تاکہ عالم اسلام بھی تہذیب وتمدن اور علم وحکمت میں متمدن ملکوں کا ہم پایہ ہوجائے۔(۴۰)

الغرض انیسویں صدی کے آخری عشرہ سے ہندوستان ومصر وغیرہ ممالک میں روایتی دینی درسگاہوں کے نظام تعلیم کی تشکیل نو کے سلسلے میں مسلمان مفکرین کی طرف سے وقتاً فوقتاً جو تجاویز منظر عام پر آئی ہیں ان میں علامہ موسیٰ جاراللہ کی تجاویز ممتاز ومنفرد حیثیت کی حامل ہیں۔ ۱۸۹۰ء کی دہائی

میں ہندوستان میں ندوۃ العلماء کی طرف سے دینی تعلیم کے لیے جو اصلاحی نصاب مرتب کیا گیا تھا اس میں انگریزی کی معمولی تعلیم اور جغرافیہ وتاریخ اور ریاضی کے مضامین کی شمولیت پر اکتفا کرلیا گیا، البتہ عربی زبان وادب کی تدریس اور اس زبان میں تصنیف وتالیف پر خاصا زور دیا گیا۔(۴۱) ندوۃ العلماء کی طرف سے روایتی نظام تعلیم کی اصلاح کے بارے میں بڑے بلند عزائم کا اظہار کیا گیا تھا، مگر افسوس کہ اس کا تجویز کردہ نصاب ان عزائم کے تقاضوں سے میل نہ کھاتا تھا۔(۴۲) بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کے بعض علماء کی طرف سے وحدت نظام تعلیم کا نظریہ شدومد سے پیش کیا گیا۔اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور عثمانیہ یونیورسٹی کے استاذ مولانا مناظر احسن گیلانی (۱۸۹۲-۱۹۵۶ء) کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے۔(۴۳) مولانا گیلانی کے نظریے کے مطابق دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں اصلی اور مرکزی حیثیت صرف اور صرف تین بنیادی مضامین تفسیر، حدیث اور فقہ کو ہے۔چنانچہ ان مضامین میں سے چند منتخبہ کتب (جلالین، مشکوٰۃ اور ہدایہ وشرح وقایہ) کو اگر جدید طرز کی جامعات اور کالجوں کے نصاب میں شامل کرلیا جائے اور ان کی مؤثر ومعقول طور پر تدریس کا انتظام کرلیا جائے تو قدیم اسلامی اور جدید مغربی نظام ہائے تعلیم کے درمیان خلیج کو ختم کرکے تعلیمی نظام کی وحدت کو قائم کیا جاسکتا ہے۔(۴۴) بادی النظر میں مولانا مناظر احسن گیلانی کا تجویز کردہ نسخہ بڑا اہل اور آسان نظر آتا ہے، لیکن جدید یونیورسٹیوں اور کالجوں میں محض چند منتخب اسلامی متون کی تدریس وتعلیم سے ایسے افراد تیار نہیں ہوسکتے جو صحیح معنوں میں قدیم وجدید کے جامع ہوں اور دور جدید میں دینی وملی امور میں امت کی رہنمائی کا وظیفہ انجام دے سکتے ہوں۔اس سلسلے میں ضرورت ہے ایسی اسلامی جامعات کی ہے جن میں جدید مغربی علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم وفنون کا ایک جامع نصاب پڑھایا جاتا ہو۔اسلامی مدارس وجامعات کے نصابات میں محض جزوی وسطحی تبدیلی اور ان میں انگریزی زبان اور چند جدید مضامین کی معمولی نوعیت کی تدریس وتعلیم سے مذکورہ اہداف ومقاصد کا حصول ہرگز طور پر ممکن نہیں۔

اس اعتبار سے علامہ موسیٰ جارالله کی تجاویز کے بارے میں وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسلامی جامعات کے نظام تعلیم کی اصلاح کے لیے ایک نہایت مؤثر ومستحکم بنیاد فراہم کرتی ہیں۔عالم اسلام کو

دینی وملی امور میں رہنمائی کے لیے قدیم وجدید میں دستگاہ رکھنے والے جن ارباب علم وفکر کی ضرورت ہے، وہ ایک ایسی ہی جامعہ میں تیار ہوسکتے ہیں، جس کا تخیل علامہ موسیٰ جاراللہ نے پیش کیا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات وحواشی

(۱) علامہ موسیٰ جاراللہ کے احوال وآثار کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو: سید سلیمان ندوی، ''شذرات''، معارف (اعظم گڑھ)، ۴۳:۲ (فروری ۱۹۳۹ء)، ص ۸۲؛ ثروت صولت، ''موسیٰ جاراللہ''، المعارف (لاہور)، ۱۵:۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۲ء/ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ) ص ۵-۱۲؛ اختر راہی، ''علامہ موسیٰ جاراللہ''، وسطی ایشیا کے مسلمان (اسلام آباد)، ۱:۳، ۴ (نومبر، دسمبر ۱۹۹۲ء)، ص ۵-۱۱؛ محمد ارشد، ''علامہ محمد اقبال اور موسیٰ جاراللہ''، سماحت (لاہور)، شمارہ ۲ (جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲ء)، ص ۲۳۹-۲۷۰؛ موسیٰ جاراللہ، ''جامعہ اسلامیہ علمیہ کا نظام تعلیم''، جامعہ (دہلی)، ۴۴:۵ (مئی ۱۹۴۷ء)، ص ۱۰-۱۱؛ روزنامہ انقلاب، جلد ۲، عدد ۱۷، یک شنبہ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۱ء؛ حمزہ فاروقی، سفرنامۂ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۹۵-۱۹۷، ۲۴۰؛ موسیٰ جاراللہ، الوشیعۃ فی نقد عقائد الشیعۃ، ''وجہ تالیف''، ص ھ، و تا ق؛ مولانا عبدالحمید حریری، ''موسیٰ جاراللہ کی بعض تصانیف''، معارف (اعظم گڑھ)، ۶۵:۳ (مارچ ۱۹۵۰ء)، ص ۲۲۳؛ مولانا عبداللہ لغاری، مولانا عبیداللہ سندھی کی سوگذشت کامل (مرتبہ: غلام مصطفیٰ خاں) (اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، ۱۹۸۰ء)، ص ۲۳۱؛ ظفر حسن ایبک، خاطرات: آپ بیتی (مرتبہ: غلام حسین ذوالفقار) (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۲۲۳-۲۳۶، ۲۵۰-۲۵۲؛ علامہ موسیٰ جاراللہ، ''پیش لفظ''، مشمولہ مولانا عبیداللہ سندھی، الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن (لاہور: مکتبۂ اوراق، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۹-۳۲؛ وہی مصنف، ''امام عبیداللہ ابن الاسلام سندھی''، جامعہ (دہلی)، جلد ۴۰، شمارہ ۳ (ماہ ستمبر ۱۹۴۴ء)، ص ۲۲-۲۸، خصوصاً، ص ۲۵-۲۷؛ محمد سرور (مرتب)، افادات و ملفوظات امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی (لاہور: سندھ ساگر اکادمی، ۲۰۰۵ء)، ص ۴۱-۴۲ و بمواقع عدیدہ۔ سعید احمد اکبر

آبادی، ”دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات“، برہان (دہلی)، ۵۲: ۳ (ستمبر ۱۹۶۴)، ۱۸۲-۱۸۳؛ محمد خالد مسعود، ”حرفِ مترجم“ مشمولہ توشی ہیکو ازتسو، دینی اخلاقیات کے قرآنی مفاہیم (مترجمہ محمد خالد مسعود) (لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۴؛ محمد احمد سبزواری، ”مقدمہ“، مشمولہ موسیٰ جاراللہ، اسلام اور بیمہ (مترجمہ: مطیع اللہ افغانی) (دہلی: لطیفی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۴۷ء)، ص ۱۱-۱۴۔ مزید دیکھیے:

Azade-Ayse Rorlich, "Musa Yarullah Bigi", in John L. Esposito (ed.), *The Oxford Encyclopedia of the Modern Islamic World* (New York: Oxford University Press, 1995), vol. I, p. 216; Elmira Akhmetova, "Musa Jarulla Bigiev (1875-1949): Political Thought of a Tatar Muslim Scholar", *Intellectual Discourse* (Kaula Lumpur), 16:1 (2008), p. 51-57; Serge A. Zenkovsky, *Pan-Turkism and Islam in Russia* (Cambridge, Mass.: Harvard University Press, 1960), pp. 45-50; Rorlich, "Musa Yarullah", p. 216; Adeeb Khalid, *The Politics of Muslim Cultural Reform: Jadidism in Central Asia* (Karachi: Oxford University Press, 2000), pp. 261-262; Charles Kurzman, *Modernist Islam, 1840-1940: A Source Book* (New York: Oxford University Press, 2002), pp. 254; Alexandre Bennigsen and Marie Broxup, *The Islamic Threat to Soviet State* (Rawalpindi: Services Book Clup, 1984), p. 71; Arthur Jeffery, *Materials for the History of the Text of the Qur'an: The Old Codices* (Leiden: E. J. Brill, 1937), p. x; Muhammad Hajjan Shaikh, *Maulana Ubaidullah Sindhi: A Revolutionalry Scholar* (Islamabad: NIHCR, 1986), pp. 189-191 and passim..

(۲) شاہ معین الدین احمد ندوی، ”شذرات“، معارف (اعظم گڑھ)، جنوری ۱۹۵۴ء، ص ۳۔

(۳) سعید احمد اکبرآبادی، ”دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات“، ص ۵۴۔

(۴) ریاض الحسن، ”ترجمان القرآن“، مشمولہ ابوسلمان شاہجہان پوری (مرتب)، مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ (کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۸۶ء)، ص ۵۱۔

(۵) رئیس احمد جعفری، دید و شنید (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۴۸ء)، ص ۴۲-۴۴۔

(۶) علامہ موسیٰ جار اللہ، ''جامعہ اسلامیہ علمیہ کا نظام تعلیم''، ص ۹-۱۰۔

(۷) دیکھیے: سید سلیمان ندوی، ''شذرات''، معارف (اعظم گڑھ)، ۴۳:۲ (فروری ۱۹۳۹ء)، ص ۸۲؛ معارف، ۹:۵ (مئی ۱۹۲۲ء)، ص ۳۲۸۔

(۸) موسیٰ جار اللہ کے ڈاکٹر محمد اقبال سے روابط کے بارے میں دیکھیے: سید الطاف حسین، ''چند ملاقاتیں''، مشمولہ ابواللیث صدیقی (مرتب)، ملفوظاتِ اقبال مع حواشی و تعلیقات (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء)، ص ۲۰۷-۲۰۹؛ عبدالرشید طارق، ''مے شبانہ''، مشمولہ ابواللیث صدیقی (مرتب)، ملفوظاتِ اقبال، ص ۲۵۸-۲۵۹؛ شیخ عطاء اللہ (مرتب)، اقبال نامہ، ص ۱۹۰-۱۹۱؛ محمد رشد، ''علامہ محمد اقبال اور موسیٰ جار اللہ''، سماحت (لاہور)، شمارہ ۴ (جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲ء)، ص ۲۳۹-۲۷۰۔ موسیٰ جار اللہ کی بعض تصانیف خصوصاً الوشیعۃ کے علامہ محمد اقبال بڑے مداح تھے۔ دیکھیے: شیخ عطاء اللہ (مرتب)، اقبال نامہ: مجموعۂ مکاتیب اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۹۰-۱۹۱۔

(۹) اس موقع پر مولانا محمود حسن نے اپنے صدارتی خطبے میں انگریزی زبان اور جدید علوم و فنون کی تعلیم کے بارے میں اپنے موقف کا بھی اظہار کیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: سید محمد میاں، علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے (دہلی: الجمعیۃ بک ڈپو، س۔ن)، حصۂ اول، ص ۲۱۳-۲۱۵۔

(۱۰) جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے محرکات، جدوجہدِ آزادی میں اس کے کردار نیز اس کی تعلیمی پالیسی کے جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو: شیخ الہند مولانا محمود حسن، ''آزاد اسلامی اور قومی تعلیم''، جامعہ (نئی دہلی)، جلد ۳، شمارہ ۲ (دسمبر ۱۹۳۸ء)، ص ۴۹۱-۴۹۴؛ مولانا محمد علی جوہر، ''خدا پرستی، ملت پروری اور وطن دوستی''، جامعہ (نئی دہلی)، جلد ۳، شمارہ ۲ (دسمبر ۱۹۳۸ء)، ص ۴۹۵-۵۰۳؛ طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل (لاہور: مکتبۂ محمودیہ، ۲۰۰۱ء)، ص ۸۸-۱۸۹؛ قاضی محمد عدیل عباسی، تحریک خلافت (لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۰۳-۲۰۴؛ ابوسلمان شاہجہان پوری، بیسویں صدی میں ہندوستان کی ملی تحریکیں (لاہور/اسلام آباد: قندیل، ۲۰۰۹ء)، ص ۵۹۷، ۲۱۵-۲۱۸؛ سید محمد سلیمان اشرف، النور یعنی

حالات حاضرہ پر ایک مصلحانہ نظر (علی گڑھ: مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۲۱ء)، ص ۱۸۸-۱۸۹ اور بمواضع کثیرہ؛ رئیس احمد جعفری ندوی، سیرت محمد علی (دہلی: مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۳۲ء)، ص ۳۰۷-۳۱۵؛ ذاکر حسین خاں، "جامعہ ملیہ کیا ہے؟"، جامعہ (نئی دہلی)، جلد ۳۰، شمارہ ۲ (دسمبر ۱۹۲۸ء)، ص ۴۷۹-۴۸۴؛ مزید دیکھیے:

M. Naeem Qureshi, *Pan-Islamism in British India: The Politics of the Khilafat Movement 1918-1924* (Karachi: Oxford University Press, 2009), pp.186- 189, 190,300-301, 310n, 449n 178 (ch. 6); Afzal Iqbal, *Life and Times of Mohamed Ali: An Analysis of the Hopes, Fears, and Aspirations of Muslim India From 1878 to 1931* (Lahore: Institute of Islamic Culture, 1979), pp. 232-234, 305, 375, 423; Idem (ed.), *Writings and Speeches of Maulana Mohamed Ali* (Lahore: Islamic Book Foundation1987), vol. II, ch. xii, "National Muslim Education", pp. 295-318; Dietrich Reetz, Mediating the External : The Changing World and Religious Renewal in Indian Islam", in Katja Fullberg-Stolberg/ Petra Heidrich/ Ellinor Schone (eds.), *Dissociation and Appropriation: Responses to Globalisation in Asia and Africa* (Studien/Zentrum Moderner Orient, Bd. 10) (Berlin: Das Arabische Buch, 1999), pp. 75-106, esp. pp. 81-82.

(۱۱) جامعۂ ملیہ اسلامیہ کے نصاب اور مولانا محمد علی جوہر کے تعلیمی افکار کے لیے دیکھیے: ثناءالحق صدیقی، مولانا محمد علی جوہر: حیات اور تعلیمی نظریات (کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۷۵ء)، ص ۱۲۷-۱۷۵۔

(۱۲) تفصیل کے لیے حاشیہ ۴۸ کے تحت درج مآخذ کے علاوہ دیکھیے: ضیاءالحسن فاروقی، "جامعہ ملیہ اسلامیہ: ایک تعلیمی تحریک"، مشمولہ مقالات مذاکرۂ ملی "تعلیمات نبوی" (چوتھی ہمدرد سیرت کانفرنس)، جلد اول: نظریۂ و فلسفۂ تعلیم اسلامی (مرتب حکیم محمد سعید) (کراچی: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ۱۹۸۴ء)، ص ۱۴۳-۱۵۱؛ ابوسلمان شاہجہان پوری، بیسویں

صدی میں ہندوستان کی ملی تحریکیں، ص۲۱۸۔

(۱۳) سفیر اختر، پاکستانی جامعات میں عربی زبان وادب اور علوم اسلامیہ میں تحقیق (لاہور: ندوۃ المعارف، ۱۹۹۹ء)، ص۱۰-۱۱۔

(۱۴) موسیٰ جار اللہ، ''جامعہ اسلامیہ علمیہ کا نظام تعلیم''، جامعہ، (نئی دہلی)، مئی ۱۹۴۷ء، ص۹۔

(۱۵) تفصیل کے لیے دیکھیے:

Charles C. Adams, *Islam and Modernism in Egypt: A Study of the Reform Movement Inaugurated by Muhammad 'Abduh* (London: Oxford University Press, 1933), pp. 70-78.

(۱۶) تفصیل کے لیے دیکھیے:

Selcuk Aksin Somel, *The Modernization of Public Education in the Ottoman Empire 1839-1908* (Leiden: Brill, 2001).

(۱۷) ایضاً، ص۱۲-۱۳
(۱۸) ایضاً، ص۱۱-۱۲
(۱۹) ایضاً، ص۱۴
(۲۰) ایضاً، ص۱۲
(۲۱) ایضاً، ص۱۳-۱۴
(۲۲) ایضاً، ص۱۴
(۲۳) ایضاً، ص۲۱
(۲۴) ایضاً، ص۱۵
(۲۵) ایضاً، ص۱۶
(۲۶) ایضاً، ص۱۶
(۲۷) ایضاً، ص۱۷
(۲۸) ایضاً، ص۱۷-۱۸
(۲۹) ایضاً، ص۱۸
(۳۰) ایضاً، ص۱۸-۱۹
(۳۱) ایضاً، ص۱۹
(۳۲) ایضاً، ص۱۹
(۳۳) ایضاً، ص۲۰
(۳۴) ایضاً، ص۲۰
(۳۵) ایضاً، ص۲۰-۲۱
(۳۶) ایضاً، ص۲۱
(۳۷) ایضاً، ص۲۲
(۳۸) ایضاً، ص۲۲
(۳۹) ایضاً، ص۲۲-۲۳
(۴۰) ایضاً، ص۲۳

(۴۱) ندوۃ العلماء کے قیام، اہداف ومقاصد، خصوصاً اس کے مرتب کردہ اصلاحی نصاب نیز دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نظام تعلیم کے بارے میں ملاحظہ ہو: سید سلیمان ندوی، حیات شبلی (اعظم گڑھ: دار المصنفین، ۲۰۰۲ء)، ص۲۹۸-۳۱۷، ۳۱۲-۳۲۳، ۴۲۳ وبمواضع عدیدہ؛ سید محمد الحسنی، سیرت مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء (کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۸۴ء)، باب ۳، ۴، ص۷۰ تا ۲۹۰؛ سید سلمان حسینی ندوی، ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟

(کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۲۴-۱۴۴۔

(۴۲) ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام اور پاکستان: تاریخی، سیاسی، علمی اور ثقافتی بس منظر (لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن، ۲۰۰۵ء)، ص ۷۶-۷۷؛ سلمان حسینی ندوی، ہمارا نصاب تعلیم کیا ہوا؟، ص ۱۲۳-۱۲۴۔ مزید دیکھیے: Muhammad Mujib, *The Indian Muslims* (London: George Allen & Unwin, 1967), pp. 522-523

(۴۳) مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے احوال و آثار کے بارے میں ملاحظہ ہو: سید ابوالحسن علی ندوی، پرانے چراغ (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، جلد ۱، ص ۶۳-۹۵؛ مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی، حیات مولانا گیلانی (کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۹۴ء)؛ ابوسلمان شاہجہان پوری، مولانا سید مناظر احسن گیلانی: شخصیت اور سوانح (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۲۰۰۲ء)۔

(۴۴) مولانا مناظر احسن کے نظریہ وحدت نظام تعلیم کے بارے میں ملاحظہ ہو: سید مناظر احسن گیلانی، برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (لاہور: المیزان، ۲۰۰۶ء)، جلد ۱، ص ۲۵۲-۲۶۵؛ جلد ۲، ضمیمہ ص ۶-۱۲؛ وہی مصنف، مقالات گیلانی (لاہور: شیخ زاید اسلامک سنٹر، ۲۰۰۴ء)، مقالہ: ۵ ''میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ''، ص ۱۹۷-۲۱۲۔

❁❁❁